چھوٹی سی دنیا

کالم

حیدرقریشی

انٹرنیٹ ایڈیشن

CHHOTI SI DUNIYA
Columns
By: Haider Qureshi

نام کتاب: چھوٹی سی دنیا (صحافتی تبصروں، تجزیوں پر مشتمل کالم)
کالم نگار: حیدرقریشی

مصنف کا پتہ: **Rossertstr.6, Okriftel,**
65795 Hattersheim,Germany
E-Mail: haider_qureshi2000@yahoo.com

سرورق: ارشد خالد
سالِ اشاعت: ۲۰۱۲ء۔ انٹرنیٹ ایڈیشن

انتساب

ہائیڈل برگ یونیورسٹی میں اردو اور ہندی کی استاد

ڈاکٹر کرسٹینا اوسٹر ہیلڈ کے نام

جنھوں نے ان کالموں کو پڑھ کر حیرت آمیز مسرت کا اظہار کیا

نئے زمانے۔۔۔ نئے آسمان سے آ کر
نئی زمینوں کی جانب اشارا کرتے ہیں

مولا کی عنایت تھی
اپنے مقدر میں
جرمن کی ''ولایت'' تھی

خوش قسمتی کا مارا
دل کلّھم کلھا
اور کثرتِ نظارا

خود کار نظام ملے
جرمنی میں آ کر
کتنے آرام ملے

ترتیب

ابتدائیہ

نہ نہ کرتے بھی حالاتِ حاضرہ پر میرے کالموں کے تین مجموعے چھپ چکے ہیں۔اس کے بعد میں اس کارِ خیر سے توبہ تائب ہو چکا تھا۔لیکن مغربی دنیا کے بارے میں ہمارے پاکستانی معاشرے میں جو غلط فہمیاں جان بوجھ کر پھیلائی جا رہی تھیں اور جن کے نتیجہ میں اہلِ مغرب کا کچھ بھی بگڑنے والا نہیں تھا، مجھے خیال آیا کہ اس حوالے سے تصویر کا دوسرا رخ بھی سامنے لایا جائے۔ اس احساس کے ساتھ میں نے چند مختصر سے کالم رمضامین لکھے جو ادھر اُدھر اخبارات میں چھپ گئے۔مقصد صرف اتنا ہے کہ ہم لوگ شتر مرغ کی طرح اپنا سر ریت میں دے کر خوش نہ ہوں۔بلکہ کھلی آنکھوں سے بدلتی ہوئی دنیا کو دیکھیں۔سو اس طرح یہ مختصر سا چوتھا مجموعہ بھی بن گیا ہے۔

یہ صرف سات کالم لکھے گئے تھے۔لکھنے کو بہت کچھ ہے۔مثلاً:

پاکستانی قوم ہمیشہ داغ داغ اجالا اور شب گزیدہ سحر کے فریب کا ہی شکار ہوتی آ رہی ہے۔آزاد عدلیہ کے نام پر افتخار چوہدری نے قوم کے ساتھ جو بھیانک مذاق کیا ہے، اس کی قیمت ابھی پوری قوم کو چکانا ہوگی۔میں اس معاملہ میں اعتزاز احسن، علی احمد کرد، اور فیصل رضا عابدی سے اتفاق کرتا ہوں۔اور اپنے سابقہ کالموں میں آزاد عدلیہ تحریک کی حمایت کرنے پر شرمندہ ہوں۔ سپریم کورٹ عدلیہ کی آزادی کے نام پر ماورائے آئین فیصلے کر کے مادر پدر آزاد ہو چکی ہے۔اور اب تو پدر نے پسر کو بھی عدالتی تحفظ کے ساتھ لوٹ مار کی آزادی دلا دی ہے۔

آزاد میڈیا بھی مادر پدر آزاد ہو چکا ہے۔حالاتِ حاضرہ کے پروگرام مار دھاڑ سے بھرپور شاہکار بن چکے ہیں۔اور ان ہندوستانی ریاستوں کے تہذیبی زوال کا نقشہ دکھا رہے ہیں جب تیتر، بٹیر اور مرغوں کی لڑائی سے لے کر ریچھ اور کتوں کی لڑائیوں تک کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ان تہذیبوں کے انجام سے پاکستان کے انجام کا بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔خدا کوئی بہتر صورت پیدا

کر دے اور ملک کسی بڑی تباہی سے بچ جائے۔میڈیا کے ماردھاڑ والے ٹاک شوز کو چھوڑ کر کامیڈی شوز دیکھے جائیں تو احساسِ زیاں اور بھی بڑھ جاتا ہے۔عربی کے ایک مشہور مقولہ کا اردو ترجمہ یوں ہے: **کلام میں ظرافت کو وہی مرتبہ حاصل ہے جو کھانے میں نمک کو حاصل ہوتا ہے**

کامیڈی شوز میں کھانا کم اور نمک زیادہ ہو چکا ہے،اس کے باوجود شوز کے اینکرز کا کہنا ہے کہ انہوں نے بڑے لذیذ شو پیش کیے ہیں۔ایسے صاحبان اپنے پروگرام کی ریٹنگ کے ثبوت بھی پیش کرتے ہیں اور مجھ جیسے ناظرین یہ سوچتے رہ جاتے ہیں کہ کسی محدود ریٹنگ کو معیار مانا جاسکتا ہے تو پھر پاکستان تو دنیا بھر میں فحش ویب سائٹس کو وزٹ کرنے والا پہلے نمبر کا ملک ہے۔ریٹنگ تو پھر سب سے زیادہ فحش ویب سائٹس کی ہوئی۔اس کے باوجود قومی منافقت کا یہ عالم کہ سپریم کورٹ میں فحاشی کے خلاف درخواستیں دائر کردی گئی ہیں۔اس کے نتیجہ میں یہ سوال پھر اُٹھ کھڑا ہوا ہے کہ فحاشی کی تعریف کیا ہے اور اس کے حدود و قیود کیا ہیں؟

مجھے قرآن شریف کی بعض آیات میں مخصوص انسانی اعضاء کے الفاظ یاد آتے ہیں،انہیں ترجمہ کرتے ہوئے اردو کے اچھے پیرائے میں بیان کیا جاتا ہے۔لیکن ان کی تھوڑی سی تشریح کرنا مقصود ہو تو شاید کوئی اپنے بچوں کے سامنے ایسا نہیں کر سکے گا۔مجھے بخاری شریف کا باب غسل بھی یاد آتا ہے۔مجھے اسلامی روایات میں مذکور مباشرت کے طریقوں کا دھیان بھی آتا ہے۔ان ساری حساس جنسی باتوں کو ایک احتیاط کے ساتھ ہی زیرِ بحث لایا جاسکتا ہے۔لیکن جو ملک فحش ویب سائٹس دیکھنے میں دنیا بھر میں پہلے نمبر پر ہو اور وہاں اللہ کے نیک بندے فحاشیت کے خلاف سپریم کورٹ میں پہنچ چکے ہوں اور سپریم کورٹ کے اپنے احوال خود ایک فحش روپ اختیار کر چکے ہوں۔وہاں بندہ کس کس بات کی طرف توجہ کرے اور کس کس بات کی طرف توجہ دلائے۔

کالم نگاری کے نام پر جو کچھ بچا کھچا موجود تھا اس مختصر سی ای بک میں پیش کر رہا ہوں۔

خوش رہو اہلِ چمن،ہم تو چمن چھوڑ چکے

حیدر قریشی (جرمنی) ۳۰ راگست ۲۰۱۲ء

یورپ کی سچائیاں اور ہماری غلط فہمیاں

مغربی دنیا کے حوالے سے ہمارے ذہنوں میں بہت سے غلط فہمیاں ہماری لاعلمی و بے خبری کے باعث راسخ ہوگئی ہیں۔میرا مقصد مغرب کا دفاع کرنا نہیں ہے کہ انہیں اپنے دفاع کے لیے میرے جیسے کسی لکھنے والے کی حمایت کی ضرورت نہیں ہے۔جو قومیں اپنے وضع کردہ اصولوں اور قوانین پر خود عمل پیرا ہوں،ان کا طرزِ معاشرت خود اپنے ہونے کا ثبوت ہوتا ہے۔میں یہاں سیاسی تناظر کو بالکل چھوڑ کر سماجی سطح پر چند مثالیں اور وضاحتیں پیش کروں گا۔تاکہ دونوں معاشروں کا فرق واضح طور پر سمجھ میں آسکے۔

ایک بار پاکستانی اخبار میں خبر چھپی کہ سائنس کے شعبہ کے محققین نے چائے پینے کو صحت کے لیے مفید قرار دیا ہے۔اس پر ایک معروف اخبار کے ممتاز کالم نگار نے طعن وطنز سے چوتھائی کالم بھر دیا۔دراصل موصوف کے ذہن میں صرف برطانیہ برانڈ پاکستانی چائے تھی۔مغربی دنیا میں بلیک ٹی کو انگلش ٹی بھی کہا جاتا ہے اور اسے بہت کم پیا جاتا ہے۔اس کے برعکس یہاں بعض پھلوں اور جڑی بوٹیوں کی چائے پینے کا رواج عام ہے۔میں ذاتی طور پر سونف کی چائے پیا کرتا ہوں۔کسی علالت کی صورت میں پودینے رپیپرمنٹ کی چائے پیتا ہوں۔پھلوں میں سٹرابیری کی چائے یہاں کافی پسند کی جاتی ہے۔اس طرح اور بھی کئی اقسام کی چائے پی جاتی ہے۔محققین نے اس پورے تناظر میں بات کی تھی۔ہمارے پاکستانی ممتاز کالم نگار نے اپنے گھر کی چائے پیتے ہوئے اہلِ مغرب کو برا بھلا کہہ کر اپنے ''صاحبِ ایمان'' ہونے کا حق ادا کر دیا۔

مغربی دنیا میں زندگی بہت مصروف ہے۔گھر کا ہر فرد اپنی اپنی ڈیوٹی کر رہا ہوتا ہے۔بزرگوں کے بوڑھے ہوجانے کی صورت میں انہیں اولڈ ہوم میں داخل کرادیا جاتا ہے۔ جہاں ان کی مناسب دیکھ بھال ہوتی رہتی ہے۔ہم اپنے مشرقی انداز معاشرت کے باعث مغربی طرزِعمل کی مذمت کرتے رہتے ہیں۔ ہر چند مغربی معاشرت کے اس انداز میں کچھ منفی بھی ہے،لیکن وہ نہیں جو ہم اپنے طور پر تصور کر لیتے ہیں۔منفی یہ ہے کہ بچوں کی پیدائش کے بعد ان کی دیکھ بھال اور پرورش پر پوری توجہ نہیں دی جاتی،نوجوان والدین اپنی زندگی کی لذت کشید کرنے میں زیادہ مصروف رہتے ہیں اور بچے ایک طرح کی تنہائی کا شکار ہوتے ہیں۔ان والدین کے بوڑھے ہونے کے بعد ان کے بچے بھی ان کے ساتھ ملتا جلتا سلوک کرتے ہیں،یعنی انہیں اولڈ ہوم میں داخل کر جاتے ہیں۔تاہم اس سارے سسٹم کا سب سے اہم اور قابلِ قدر پہلو یہ ہے کہ جن والدین کو بچے اپنی ملازمتوں کے باعث گھر پر پوری توجہ نہیں دے سکتے۔ان کی غیر موجودگی میں کسی ایمرجنیسی کی صورت میں بزرگوں کی زندگی کا نا قابلِ تلافی نقصان ہوسکتا ہے،انہیں اولڈ ہومز میں پوری توجہ دی جاتی ہے۔عام دیکھ بھال سے لے کر کسی ایمرجنیسی کی صورت تک اولڈ ہوم میں خدمتگار موجود ہوتے ہیں۔معذور افراد کی دیکھ بھال میں اتنی زیادہ احتیاط کی جاتی ہے کہ گھر پر اتنی توجہ دینا اور اتنی نرسنگ ممکن ہی نہیں۔والدین کی اولاد کی ان سے وابستگی کم نہیں ہوتی بلکہ مزید بڑھ جاتی ہے۔بھائی،بہن آپس میں طے کر لیتے ہیں اور لگ بھگ روزانہ یا ہفتہ وار والدین کو ملنے جاتے رہتے ہیں۔اولڈ ہومز میں جو معاشرتی سہولیات میسر ہیں ان کے باعث بوڑھوں،بزرگوں کی اپنی ایک نئی دنیا آباد ہو جاتی ہے۔

مغربی زندگی کے اس پہلو پر جب ہمارے لکھنے والے حسبِ عادت غیر ضروری تنقید کر رہے ہوتے ہیں تو مجھے اپنے ہاں کے ایسے کئی بزرگ یاد آتے ہیں جنہیں ان کی اولاد نے بڑھاپے میں ٹھوکریں کھانے کے لیے چھوڑ دیا۔جو کوئی مناسب اولڈ ہوم نہ ہونے کے باعث انتہائی تکلیف دہ بڑھاپا گزارنے پر مجبور ہوتے ہیں۔عام کہانیوں کو چھوڑیں ہمارے اردو ادب کے نامور ادیب صحرانورد کے خطوط والے میرزا ادیب جب عمر کے بے بسی والے دور میں داخل ہوئے تو انہیں ان

کے اس بیٹے نے گھر سے نکال دیا جنہیں انہوں نے محنت مشقت کر کے ڈاکٹری کرائی تھی۔اور وہ دوسرے ادیبوں سے پوچھتے پھرتے تھے کہ ہمارے ہاں کوئی اولڈ ہوم نہیں ہوتا؟

مغربی معاشرت کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے ہاں کی گندگی کو قالین کے نیچے چھپا کر نیکی اور تقویٰ کے بلند بانگ دعوے نہیں کرتے۔بلکہ جہاں کہیں کوئی گندگی دکھائی دیتی ہے،اسے سب کے سامنے لایا جاتا ہے۔مسیحی چرچ میں جونئیر پادریوں کے ساتھ یا ننز خواتین کے ساتھ جنسی مسائل سامنے آتے ہیں تو کسی خوف کے بغیر ان کو بھی سرِ عام بیان کیا جاتا ہے۔یہاں تک کہ بعض اوقات پوپ کو خود معذرت کرنا پڑ جاتی ہے۔اس کے برعکس ہمارے ایک وزیر مملکت نے بعض دینی مدارس میں اسی نوعیت کے اخلاقی مسائل کی نشان دہی کی تو ان کے خلاف ایک طوفانِ بدتمیزی برپا کر دیا گیا۔کچھ عرصہ کے بعد موصوف کی وزارت بھی جاتی رہی۔ہم قالین کے نیچے گندگی کو چھپا کر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ کسی کو کچھ پتہ نہیں چلا۔حالانکہ اس سے تو سارے معاشرے میں تعفن پھیل جاتا ہے۔

جرمنی یورپ کا سب سے زیادہ صاف ستھرا ملک ہے۔ہم اپنے پاکستانی معاشرے میں اس فرمانِ نبویؐ پر ایمان رکھتے ہوئے کہ ’’صفائی نصف ایمان ہے‘‘،صفائی سے بیگانہ ہیں۔ہمارے گلی،محلے،شہر سب صفائی کی افسوسناک حالت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔اس سب کے برعکس مغربی دنیا کسی حدیث شریف کا حوالہ دیئے بغیر گلی،محلوں اور شہروں میں صفائی کا جو منظر پیش کر رہی ہے وہ بھی ہمارے سامنے ہے۔ان بظاہر چھوٹی چھوٹی باتوں سے شاید ہمیں اپنی سوچ پر از سرِ نو غور کرنے کی توفیق ملے۔اور ہم نئے سرے سے یہ سوچنا شروع کر سکیں کہ دوسری اقوام کیسے اتنی ترقی کر گئیں اور ہم کیوں اتنا پیچھے رہ گئے۔

روزنامہ **مقدمہ** کراچی مورخہ ۵؍جنوری ۲۰۱۰ء

روزنامہ **ہمارا مقصد** دہلی مورخہ ۸؍جنوری ۲۰۱۰ء

غریب کی حق تلفی مغربی سازش نہیں کہلا سکتی

جب میں مغربی دنیا کے بارے میں کچھ کہتا ہوں تو میرے پیشِ نظر سب سے پہلے جرمنی ہوتا ہے۔تاہم اسی کے تناظر میں بڑی حد تک باقی یورپی ممالک اور امریکہ وکینیڈا کے ماحول کو بھی شامل رکھنا چاہیے۔یہاں فراہمی آب اور نکاسیٔ آب کی سہولت، سردیوں میں گھروں کو گرم رکھنے کے لیے ہیٹنگ سسٹم کی سہولت، بجلی کی سہولت کسی بڑے سے بڑے شہر سے لے کر چھوٹے سے چھوٹے گاؤں تک فراہم کی گئی ہے۔سڑکوں کا جال بھی اسی طرح پھیلا ہوا ہے اور دور دراز کے دیہات والے بھی سڑک کے ذریعے آسانی سے کہیں بھی آجا سکتے ہیں۔یہ سہولیات فراہم کرتے ہوئے نہ تو کسی چھوٹے یا بڑے شہر کا امتیاز برتا گیا ہے، نہ کسی قصبہ یا دیہات میں تفریق کی گئی ہے۔جبکہ ہمارے ہاں تو ایک شہر ہی میں پوش علاقوں اور غریب عوامی علاقوں میں ایسی سہولیات کے سلسلہ میں جو واضح فرق موجود ہے، اس کا ذکر کرتے ہوئے بھی دکھ ہوتا ہے۔ویسے کوئی بات ہو ہم فوراً اسلامی حوالہ جات پیش کر کے اپنی عظمت کا پرچم بلند کر لیتے ہیں لیکن ہمارے معاشرے کی عملی صورتحال کتنی مختلف ہے، غریب اور دکھی عوام سے زیادہ اسے کون جانتا ہے۔

اسلام کے اقتصادی نظام کی تشریح وتفسیر کے حوالے سے میں حضرت علیؓ اور حضرت ابوذرؓ غفاری کے فرمودات کو زیادہ اہم سمجھتا ہوں۔تاہم حضرت عمرؓ کے اس فرمان میں بھی سرکاری ذمہ داری کا اسلامی تصور واضح طور پر موجود ہے جس میں دریائے فرات کے کنارے بھوکے یا پیاسے مرجانے والے کتے کی موت کی ذمہ داری بھی انہوں نے اپنے ذمہ لی تھی۔لیکن افسوس ہے کہ اس معاملہ میں سارے مسلمان ممالک واضح فلاحی قوانین سے عاری ہیں۔اس کے برعکس مغربی دنیا

میں فلاحی قوانین کے تحت ہر بے روزگار کو معین مالی امداد دی جاتی ہے۔اگر کسی کی تنخواہ وہاں کے کم از کم مالی معیار سے تھوڑی ہے تو حکومت اسے بقیہ رقم کے طور پر مزید امداد فراہم کرتی ہے۔اس کے لیے کاغذات کی مکمل جانچ پڑتال کی جاتی ہے اور اس کے مطابق اسے نہ صرف مزید رقم دی جاتی ہے بلکہ کوشش کی جاتی ہے کہ اس فراہمی میں غیر ضروری تاخیر نہ ہو۔بات صرف مالی امداد تک محدود نہیں بلکہ جس کے پاس گھر نہیں ہے اسے گھر کی سہولت فراہم کی جاتی ہے۔وہ جتنا کرایہ ادا کرنے کی سکت رکھتا ہے، اس سے لیا جاتا ہے، باقی کرایا سرکاری طور پر ادا کیا جاتا ہے۔کرایا ادا کرنے کی بالکل سکت نہ رکھتا ہو تو سارا کرایہ حکومت ادا کرتی ہے۔

اگر کوئی خود کفیل ہے تو ملکی قوانین کے مطابق انہیں طبی سہولیات میسر رہتی ہیں۔اگر کوئی خود کفیل نہیں ہے اور حکومت سے اسے امداد ملتی ہے تو اس کی ساری طبی سہولیات فری ہوتی ہیں۔طبی سہولیات میں ڈاکٹرز کے علاج سے لے کر تمام دواؤں کی فراہمی تک سب کچھ فری ہوتا ہے ، چاہے وہ دوائیں کتنی ہی مہنگی کیوں نہ ہوں۔رعائت ملتی ہے تو غریب افراد کو، جبکہ خود کفیل افراد کو بہر حال اپنا خرچہ خود اٹھانا ہوتا ہے۔کسی حادثہ کی صورت میں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ حادثہ کا شکار ہونے والا کون ہے، بلا امتیاز رنگ ونسل و مذہب پہلے حادثہ کے شکار کی جان بچانے کی کوشش کی جاتی ہے، اس کے لیے حادثہ کی نوعیت کے مطابق ایمبولینس سے لے کر ہیلی کاپٹر تک کی سہولت ہمہ وقت دستیاب رہتی ہے۔ہسپتالوں میں صفائی کا اعلیٰ ترین معیار دیکھنے کو ملتا ہے تو علاج معالجہ میں ہسپتال کا عملہ سچ مچ مسیحا جیسے کردار کا حامل ہوتا ہے۔شخصی سطح پر بعض منفی استثنائی مثالیں بھی مل جاتی ہیں لیکن شرح کے اعتبار سے انہیں بمشکل پانچ فی صد کہا جا سکتا ہے۔اس کے برعکس ہمارے ہاں تمام بہتر طبی سہولیات اشرافیہ طبقہ کے لیے مخصوص ہیں۔غریب اپنی جیب سے دوا خریدے تو دوا بھی جعلی ملتی ہے۔

یہاں کا ٹیکس کا نظام بہت عمدہ ہے۔کوئی پارٹ ٹائم جاب کرتا ہے تو اس کی آمدنی کے حساب سے اس کا ٹیکس کاٹ لیا جاتا ہے۔رقم کم پڑتی ہے تو فلاحی قوانین کے تحت سوشل ہیلپ کر دی جاتی ہے لیکن ٹیکس میں چھوٹ نہیں دی جاتی۔گویا کمانے والے ہر بندے کو ٹیکس دینا ہوتا

ہے۔اس کے برعکس ہمارے ہاں ٹیکس چوری کو سٹیٹس سمبل سمجھ لیا گیا ہے۔بڑے بڑے سیاستدان جو کرپشن کے خلاف بڑی بڑی تقریریں کرتے ہیں،ان کی انڈسٹریز اور جائیدادوں کو سامنے لایا جائے اور پھر ان کے ادا کردہ ٹیکسوں کا ریکارڈ سامنے لایا جائے تو اندازہ ہوگا کہ ہمارے ہاں ''کمیشن کرپشن'' نے اتنی لوٹ نہیں مچائی جتنی قرض لے کر معاف کرا لینے والے مافیا اور ٹیکس چوری کلچر نے پہنچائی ہے۔

اپنے ہاں امیر اور غریب کی تفریق گوارا کی جا سکتی ہے لیکن جہاں غریب کو غربت کے ہاتھوں بھوکا مرنا پڑے،سردی میں ٹھٹھر کر مرنا پڑے،گرمی میں فٹ پاتھ پر سوئے ہوؤں پر گاڑیاں چڑھ جائیں۔جہاں سڑکیں کسی بڑے کے گاؤں تک جا کر رک جائیں،جہاں بڑوں کے گھروں تک موٹر وے کے اربوں روپے جھونک دیئے جائیں،جہاں بجلی،پانی کی فراہمی اور نکاس کی سہولتیں صرف امیر علاقوں کے لیے مخصوص ہوں اور باقی لوگ آلودہ پانی پینے پر مجبور ہوں اور جن کے گلی کوچوں میں نالیاں اور گٹر ابل رہے ہوں،وہاں جس قسم کی نعرہ بازی کو رواج دے لیا جائے تمام نعروں کا مقصد صرف یہی ہے کہ غریب کو اس کے حقوق نہ ملنے دیئے جائیں۔ہمارے رہنما یہ کہتے نہیں تھکتے کہ ہمارے خلاف امریکہ اور اس کے حلیف سازشیں کر رہے ہیں لیکن کوئی ہے جو یہ بتائے کہ پاکستان کے غریب اور غریب ترین عوام کو بنیادی انسانی ضروریات اور سہولیات سے محروم رکھنے میں ان مغربی ممالک کی کتنی سازش شامل ہے اور ان رہنماؤں کی کتنی سازش شامل ہے۔کیا ہمارے ہر قسم کے قومی رہنما اس حوالے سے اپنے گریبانوں میں جھانکنا گوارا کریں گے؟

روزنامہ **مقدمہ** کراچی مورخہ۔۱۴؍جنوری ۲۰۱۰ء

روزنامہ **ہمارا مقصد** دہلی مورخہ ۱۴؍جنوری ۲۰۱۰ء

گناہ وثواب:مشرق ومغرب

اپنے حالیہ کالم لکھتے ہوئے میرے پیش نظر پہلی بات یہی ہے کہ وطنِ عزیز میں مغربی دنیا کی عام زندگی سے متعلق جو غیر ضروری غلط فہمیاں پھیلائی گئی ہیں ان کے سامنے تصویر کا دوسرا رخ بھی پیش کیا جائے۔بہتر زندگی سے بہترین زندگی کا سفر دھرتی پر سب سے پہلے انسان کی زندگی سے ہی شروع ہے اور اس دھرتی پر آخری انسان کی موجودگی تک یہ سفر جاری رہے گا۔مغربی مفکرین خود اپنے معاشرے کی خامیوں اور خرابیوں کی نشان دہی کرتے رہتے ہیں۔ان کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ ہمارا اچھا معاشرہ مزید اچھا ہو سکے۔ہم اس معاشرہ پر تنقید کرتے ہوئے تب اچھے لگتے ہیں جب ہم سماجی سطح پر ہر شہری کو بنیادی ضروریات اور بنیادی انسانی حقوق مہیا کر دیں۔اس معاملہ میں ہم ابھی مغربی دنیا سے صدیوں پیچھے ہیں۔

مغربی دنیا میں جنسی آزادی کا جو تصور ہے وہ ان کے معاشرے کی اپنی پیش رفت ہے۔وہ اسے گناہ نہیں سمجھتے اور گناہ نہ سمجھ کر جو کچھ کرتے ہیں،اطمینان سے کرتے ہیں۔ہمارا معاملہ یوں ہے کہ ہم گناہ کو گناہ مانتے ہیں اور پھر بھی چوری چھپے اس کا ارتکاب کرنے کے لیے موقعہ کی تاک میں رہتے ہیں،ان دونوں رویوں کو ایک اور زاویے سے بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ ہم لوگ گناہ کرتے ہیں تو اسے بہر حال گناہ سمجھتے ہیں اور اپنی کمزوری کے باعث اس کا ارتکاب کرتے ہیں۔جبکہ مغربی دنیا گناہ کو گناہ مانتی ہی نہیں۔اپنی شخصی آزادی قرار دیتی ہے۔اس بات سے دو سادھوؤں کا قصہ یاد آ گیا۔دو سادھو کسی سفر پر جا رہے تھے،رستے میں ایک بڑی نہر آ گئی۔انہوں نے دیکھا کہ وہاں

ایک نوجوان لڑکی نہر پار کرنے کی غرض سے پریشان کھڑی ہے۔ایک سادھو نے لڑکی سے کہا کہ تم میرے کندھے پر بیٹھ جاؤ میں تمہیں بھی نہر پار کرا دیتا ہوں۔لڑکی اس کے کندھے پر بیٹھ گئی۔نہر کے دوسرے کنارے پر جا کر سادھو نے لڑکی کو اتار دیا۔وہ اپنی منزل کی طرف روانہ ہوگئی اور دونوں سادھو اپنے سفر پر چل نکلے۔دوسرا سادھو بڑی دیر تک خاموشی کے ساتھ چلتا رہا۔کافی دیر کے بعد اس نے زبان کھولی تو پہلے سادھو سے کہنے لگا ہم سادھو ہیں ہمیں تو ناری کو چھونا منع ہے لیکن تم نے ایک نوجوان ناری کو کندھے پر اٹھالیا۔اس پر پہلے سادھو نے مسکرا کر کہا میں نے تو اس ناری کو دوسرے کنارے پر پہنچتے ہی اتار دیا تھا لیکن لگتا ہے تم نے ابھی تک اسے اپنے کندھے پر سوار کر رکھا ہے۔نہ مغربی دنیا والے سادھو ہیں، نہ ہم سادھو ہیں۔اس کے باوجود جنسی معاملات میں ان کا رویہ یہ ہے کہ وہ دوسرے کنارے پر اسے اتار کر برق رفتار زندگی میں اپنے اپنے منصبی فرائض میں جٹ جاتے ہیں، جبکہ ہم ان معاملات کو اپنے کندھوں پر اس حد تک سوار کیے رکھتے ہیں کہ فرائض منصبی کے دوران بھی یہی خیالات ہمارے ذہنوں پر مسلط رہتے ہیں۔

یہاں آنے والے جنوبی ایشیائی بالعموم اور پاکستانی بالخصوص جب نئے نئے پہنچتے ہیں تو یہاں کی چکا چوند سے پوری طرح لطف اندوز ہوتے ہیں۔نہ صرف لطف اندوز ہوتے ہیں بلکہ اپنے قریبی دوستوں میں بیٹھ کر اپنی ''فتوحات'' کا ذکر فخریہ انداز سے کرتے ہیں۔تب ان لوگوں کو نہ اپنے کلچر کی یاد ستاتی ہے، نہ اسلامی احکامات یاد آتے ہیں لیکن جب ان کی اپنی اولاد جوان ہونے لگتی ہے اور وہ بھی مغربی کلچر کے مطابق زندگی گزارنے کی طرف مائل ہوتی ہے تو پھر ایسے ''فاتحین'' کو کبھی اپنا کلچر یاد آنے لگتا ہے اور کبھی اسلامی احکامات پر عمل کرنے کا احساس جاگنے لگتا ہے۔اور ساتھ ہی غشی یا دل کے دورے پڑنے لگ جاتے ہیں۔اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ ہم ڈبل سٹینڈرڈز سے کام لیتے ہیں۔

مغرب میں مقیم جنوبی ایشائیوں میں بہت سے ایسے لوگ ملتے ہیں جنہیں یہاں کے بعض قوانین سے سخت شکایات ہیں۔یہاں کی مفت ملنے والی سہولیات کا ذکر بھی ایسے کریں گے جیسے انہیں قبول کر کے مغربی دنیا پر احسان کر رہے ہوں۔میرے سامنے جب بھی کسی عزیز یا دوست

نے اس انداز کی شکایت کی، میں نے ایک ہی بات کی۔کیا تمہیں اس ملک والوں نے دعوت دے کر اپنے ہاں بلایا تھا؟ یہاں اتنے ہی دکھی ہو تو واپس کیوں نہیں چلے جاتے؟۔یہاں مجھے وہ ٹیکسی ڈرائیور یاد آ گیا جسے نائن الیون کے بعد امریکہ میں گرفتار کر لیا گیا تھا امریکی حکومت اسے پاکستان واپس بھیجنا چاہتی تھی۔تب اس نے اپیل کی تھی کہ بے شک اسے ساری زندگی قید میں رکھیں لیکن میرے ملک میں واپس نہیں بھیجیں۔

جلاوطن حکومتوں کا دوسرے ممالک میں قائم کیا جانا سمجھ میں آتا ہے لیکن پاکستان شاید واحد ملک ہے جس کی تمام سیاسی جماعتوں کی شاخیں بیرون ملک بھی قائم ہیں۔نتیجہ یہ ہے کہ یہاں پر ہر کوئی اپنی اپنی سیاسی جماعت کی ڈفلی بجا رہا ہے۔قومی یکجہتی اور پاکستانی کی حیثیت سے اتحاد و اتفاق والی کوئی بات نہیں ہے۔ہر کوئی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنا کر بیٹھا ہے۔انڈیا کے لوگ یہاں جب بھی سرگرم ہوتے ہیں انڈین کمیونٹی کی حیثیت سے سرگرم ہوتے ہیں۔یہاں انڈیا کی کسی سیاسی جماعت کی شاخ نہیں ہے۔شاید ہمارے سیاسی شعور کی ارزانی ہے یا پھر مفاد پرستی کے کئی مختلف پہلوؤں کی ہم آہنگی ہے کہ یہاں پاکستان کی ہر سیاسی جماعت کی برانچ کھلی ہوئی ہے ہر پارٹی کے عہدیدار مل جائیں گے بس خالص پاکستانی ڈھونڈنے کے لیے مشکل پیش آئے گی۔ مغربی دنیا میں حکومت پاکستان کا موقف درست طور پر پہنچ نہ پانے کی متعدد دیگر وجوہات اپنی جگہ بجا۔۔۔لیکن ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہاں کے سفارتخانے مقامی سیاسی جماعتوں کے دباؤ میں رہتے ہیں۔انہیں ایک حد تک برسر اقتدار جماعت کے عہدیداروں کو نوازنا ہوتا ہے تو دوسری طرف دوسرے پریشر گروپس کو بھی خوش رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔اس ساری کھینچا تانی میں اہم قومی مفادات پس پشت چلے جاتے ہیں اور سیاسی جماعتوں کے عہدیداروں اور سفارتی عملہ کے درمیان مقامی و ذاتی مفادات کے حصول کی دوڑ جاری رہتی ہے۔

بیرون ملک پاکستان کی تمام سیاسی جماعتوں کی شاخیں ختم کرنے سے شاید قومی یکجہتی کی کوئی صورت سامنے آ جائے۔کیا پاکستان کی تمام سیاسی جماعتیں ایسا کرنا چاہیں گی؟ اپنی سیاست پر قومی یکجہتی کو ترجیح دینے میں کم از کم ویسا رویہ اختیار کریں گی جیسا انڈیا کی سیاسی جماعتوں نے

مغربی دنیا میں اختیار کر رکھا ہے۔وہاں ان کی کوئی سیاسی برانچیں نہیں ہیں۔

روزنامہ **مقدمہ** کراچی مورخہ۔۔۱۷رجنوری ۲۰۱۰ء

روزنامہ **ہمارا مقصد** دہلی مورخہ ۲۰رجنوری ۲۰۱۰ء

ہماری اور مغربی دنیا کی پولیس کا فرق

مسلمان ممالک اور مغربی ممالک کے معاشرتی فرق کی ایک واضح اور روشن مثال دونوں معاشروں کی پولیس کا کردار اور ٹریفک کا نظام ہے۔دونوں معاشروں میں اس سلسلہ میں جو زمین ،آسمان کا فرق دکھائی دیتا ہے''برادرانِ اسلام'' کے نزدیک شاید وہ بھی امریکی رمغربی سازش کا نتیجہ ہو۔پولیس کا مجموعی کردار اپنے عوام کی مدد کرنا اور جرائم پر قابو پانا ہے۔مغربی دنیا میں سرِ راہ آپ کو کوئی مشکل پیش آ گئی ہے، آپ پولیس سے رجوع کرتے ہیں تو جو ممکنہ ہیلپ مل سکتی ہے، آپ کو مل جائے گی۔آپ نے کوئی رستہ پوچھنا ہو تب بھی وہ ایک اچھے گائیڈ کی طرح آپ کی رہنمائی کریں گے۔حال ہی میں مجھے فیس بک پر بلجیم میں مقیم اپنے ایک عزیز احسن انجم کی وڈیو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔وہ بتا رہے تھے کہ سائیکلنگ کے ایک لمبے سفر پر برسلز میں پڑاؤ کے بعد سائیکل کو دیکھا تو کوئی شریر اسے نقصان پہنچا گیا تھا۔رات ہو چکی تھی ،انہیں اور کوئی رستہ نہیں سوجھا تو وہاں کے قریبی پولیس اسٹیشن جا کر اپنا مسئلہ بیان کیا۔یہ نا قابلِ یقین بات ہے لیکن اس وقت ڈیوٹی پر موجود پولیس کے عملہ نے احسن انجم کی مکمل مدد کی اور مل جل کر سائیکل کو اس قابل کر دیا کہ وہ ۱۱۰ کلو میٹر کا سفر کر کے اپنے گھر پہنچ گئے۔ایسی مثالیں استثنائی سہی لیکن بہر حال پہلے سے موجود ایک بھروسے والی فضا میں خوشگواری کا اضافہ کرتی ہیں۔نائن الیون کے بعد مغربی دنیا کی فضا میں بڑی تبدیلی آئی ہے۔پے در پے ہر تخریبی کاروائی یا سازش میں مسلمانوں کی عمومی طور پر اور پاکستانیوں کی خصوصی طور پر نشان دہی ہوتے چلے جانا اس فضا کو مزید مکدر کرنے کا باعث بنی ہے۔مزید خرابی یہ ہوئی کہ جو غیر پاکستانی پکڑے جاتے ہیں، ان کو دہشت گردی کی تربیت دینے

کے مراکز بھی پاکستان سے نکل آتے ہیں۔مغربی دنیا میں پکڑے جانے والے بیشتر ''مجاہدین'' ایسے رہے ہیں جو یہاں کی حکومتوں سے سوشل ہیلپ لے کر گزر بسر کر رہے تھے۔اب کہہ نہیں سکتا کہ یہاں جس تھالی میں کھانا،اسی میں چھید کرنا والی بات درست بیٹھتی ہے یا نہیں۔نائن الیون سے پہلے میں افغانی ٹوپی پہنا کرتا تھا۔اس سانحہ کے بعد بھی میں نے اس کا استعمال جاری رکھا۔حالانکہ تب افغانی بھی اپنی اس نشانی کو ترک کر گئے تھے۔لیکن مجھے اس ٹوپی کی وجہ سے کسی نے کوئی روک ٹوک نہیں کی۔اپنے شہر کے بس اسٹاپ پر صرف ایک بار پولیس نے میرے کاغذات چیک کیے اور پھر مسکرا کر معذرت کے الفاظ بول کر چلے گئے۔مجھے علم ہے کہ مجھے ایک بار نہیں سینکڑوں بار خفیہ طور پر چیک کیا گیا ہوگا۔لیکن یہ نگرانی ''باور کراکے'' ہراساں کرنے والی نہیں تھی۔ایسے انداز میں نگرانی کی جاتی کہ مجھے کبھی اندازہ ہی نہیں ہو سکا۔اس کا فائدہ یہ ہوا کہ مجھے ذاتی طور پر کوئی پریشانی نہیں ہوئی اور پولیس کی اپنی جگہ پوری تشفی ہو گئی۔

مغربی دنیا میں جن لوگوں کو کسی شک و شبہ میں گرفتار کیا گیا اسے یکسر غلط کہنا زیادتی ہے۔ان میں سے جو بے قصور تھے یا مغربی قوانین کے مطابق ان کا جرم ثابت نہیں کیا جا سکا،ان سب کو رہا کیا گیا تھا۔بلکہ جن کے جرم کا علم تھا اور قانونی موشگافی کی وجہ سے سزا نہیں دی جا سکتی تھی،انہیں بھی رہا کرنا پڑا۔بہر حال یہاں کہنے کا مقصد یہ ہے کہ مغربی دنیا میں پولیس کا عمومی کردار عوام کی مدد کرنے والا ہے،عوام میں خوف اور دہشت پیدا کرنے والا نہیں۔اس کے برعکس پاکستانی پولیس ہو یا دوسرے مسلمان ملکوں کی پولیس۔ان سب کا فریضہ اپنے حکمرانوں کی حفاظت،ان کے مفادات کا تحفظ اور عوام کی تذلیل کے سوا کچھ نہیں۔کوئی عام آدمی کسی پولیس والے سے رستہ پوچھ بیٹھے تو اسے حوالات کا رستہ دیکھنا پڑ جاتا ہے اور احسن انجم کی طرح کوئی سادہ لوح سائیکل کا مسئلہ لے کر پولیس اسٹیشن چلا جائے تو اسے اپنے ہی سائیکل کی چوری کے جرم میں دھر لیا جائے گا۔

پولیس کلچر کے واضح فرق کے ساتھ مغربی ممالک کی پولیس کے زیر انتظام ٹریفک کے نظام اور مسلمان ملکوں کے ٹریفک کے نظام کے فرق سے بھی دونوں معاشروں کے فرق کو بہتر طور

پر سمجھا جا سکتا ہے۔ٹریفک کے قواعد و ضوابط صرف کتابوں میں درج کرنے کے لیے نہیں ہیں بلکہ رواں دواں سڑکوں پر ان کا مکمل طور پر اطلاق ہوتا ہے۔ان قواعد کی خلاف ورزی عام آدمی کرے ،چاہے امریکی صدر کی اولاد کرے یا ملکہ برطانیہ کے شاہی خاندان کا کوئی فرد کرے،سب کے لیے سزا یکساں ہے۔کسی کے لیے کوئی رعائت نہیں۔اگر امتیازی فرق ہو سکتا ہے تو یہ کہ شاہی خاندان کے فرد کو اصل جرمانہ سے زیادہ جرمانہ کی سزا دی جائے کہ تم پر تو قانون کا احترام کرنا عام آدمی سے بھی زیادہ واجب تھا۔مغربی ممالک کے ٹریفک سسٹم کے برعکس پاکستانی معاشرے کا ٹریفک سسٹم ہو یا دوسرے مسلمان ملکوں کا ٹریفک سسٹم ہو،سب نفسا نفسی کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ٹریفک کے قوانین کی دھجیاں نہ صرف مقتدر افراد اڑاتے ہیں بلکہ قانون نافذ کرنے والے ادارے خود اس کی پامالی کر رہے ہوتے ہیں۔غریب کے کاغذات پورے ہوں تو اس کی موٹر سائیکل میں کوئی نہ کوئی نقص ڈال کر (بلا رسید) جرمانہ عائد کر دیا جائے گا اور اشرافیہ طبقہ کے لوگ سرِ عام ٹریفک قوانین کی خلاف ورزی کر رہے ہوں گے تو بیچ چوراہے میں کھڑے ہوئے پولیس والے بھی ان سے بے خبر ہو جاتے ہیں۔یہ اصل رویے ہیں جن سے مغربی سوسائٹی اور مسلمان ملکوں کی سوسائٹی کے فرق کو سمجھا جا سکتا ہے۔اپنی ہر غلطی اور کوتاہی میں مغربی سازش ڈھونڈ نکالنا مریضانہ رویہ ہے۔جس سے مرض کا علاج نہیں ہوگا بلکہ اس میں مزید اضافہ ہوگا۔دونوں معاشروں کی پولیس کے کردار سے دونوں معاشروں کے فرق کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔مسلم ملکوں کے افسوسناک پولیس سسٹم کے ہونے میں امریکہ، جرمنی، برطانیہ،فرانس اور باقی یورپ کی کوئی سازش شامل نہیں ہے۔بے تکی الزام تراشی سے مسئلے حل نہیں ہوں گے۔ضرورت اس امر کی ہے کہ اپنی خرابیوں کو مان کر ایمانداری کے ساتھ اصلاحِ احوال کے لیے قدم اٹھایا جائے

روزنامہ **مقدمہ** کراچی مورخہ۔۲۲/جنوری ۲۰۱۰ء

روزنامہ **ہمارا مقصد** دہلی مورخہ ۲۵/جنوری ۲۰۱۰ء

پردے سے سکینگ تک

مغربی دنیا میں مقیم پاکستانی خواتین کی ایک بڑی تعداد اسلامی طریق والا پردہ نہیں کرتی۔خود پاکستان میں بھی ایک بڑی تعداد ایسی خواتین کی ہے جو پردہ کرنا ضروری نہیں سمجھتیں۔مختلف ممالک میں اور علاقوں میں پردہ یا حجاب کی نوعیت بہت زیادہ مختلف ہے۔صرف بالوں کو ڈھانپنا اور چہرہ کھلا رکھنا ایران اور ترکی سے لے کر بعض عرب ممالک تک رائج ہے۔ہمارے ہاں چادر کا پردہ بھی ہے،آدھے نقاب والا برقعہ بھی ہے اور بعض علاقوں میں شٹل کاک برقعہ بھی ہے۔شٹل کاک برقعہ والوں کے نزدیک پردہ کی باقی ساری صورتیں بے پردگی میں (بلکہ بے حیائی میں) شامل ہیں۔اس پس منظر میں مغربی دنیا میں نائن الیون کے بعد جہاں ایک طرف مغربی دنیا کی طرف سے مسلمانوں کو شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا وہیں مسلمانوں کی طرف سے مغربی دنیا سے اپنے لیے ایسے ایسے مطالبے کیے جانے لگے جنہیں مغربی معاشرے کے مجموعی ماحول میں قبول کیا جانا کافی مشکل تھا۔پردہ کے حق کے سلسلہ میں بعض مسلم خواتین کی طرف سے معمول سے زیادہ مطالبات سامنے آنے لگے۔مثلاً برطانیہ میں یارکشائر کے ایک پرائمری اسکول ہیڈ فیلڈ چرچ کی اسسٹنٹ ٹیچر عائشہ نے کلاس روم میں نقاب کے ساتھ پڑھانے پر اصرار کیا۔معاملہ زیادہ بگڑ گیا تو کہا کہ چلیں بچوں کے سامنے نقاب اتار کر پڑھاؤں گی،مگر مرد ٹیچرز سے پردہ کروں گی۔تب مجھے پاکستان کے بے شمار بڑے تعلیمی ادارے یاد آتے رہے جہاں بالغ بچوں سے پردہ بھی کبھی مسئلہ نہیں بنا اور ساتھی مرد ٹیچرز سے پردہ بھی کبھی مسئلہ نہیں بنا۔عائشہ نے مقدمہ کیا لیکن ظاہر ہے اسے یہ مقدمہ ہارنا ہی تھا۔لندن میں ایک مسلم لیڈی پولیس افسر نے

تربیت پوری ہونے کے بعد پاسنگ آؤٹ پریڈ کی تقریب میں ادارہ کے سربراہ سے مصافحہ سے انکار کر دیا تھا۔کمانڈو پولیس کی تربیت کے دوران جسموں سے جسم ٹکراتے ہیں،اگر وہ ساری تربیت روا تھی تو مصافحہ میں کیا حرج تھا؟اگر خاتون نے کسی مرد کو چھونا نہیں تو کمانڈو پولیس میں جانے کی کیا ضرورت تھی؟اگر ایسی ملازمتیں آپ کے عقائد یا ثقافت سے متصادم ہیں تو دوسری ایسی ملازمتوں کی طرف جایئے جہاں ایسی قباحت پیدا نہ ہو۔

ایسی صورتحال پر برطانیہ کے لارڈ نذیر احمد نے بجا طور پر کہا تھا کہ پردہ کا مقصد خواتین کے لیے تحفظ ہے،جبکہ یہاں مغرب میں پردہ عدم تحفظ کی علامت بنتا جا رہا ہے۔لارڈ نذیر کے بقول اسلام میں پردہ کی نوعیت ثقافتی ہے،یعنی بعض خطوں میں صرف سر کو ڈھانپا جاتا ہے،بعض میں چہرہ کو نیم پردہ کے ساتھ اور بعض میں مکمل پردہ کے ساتھ ڈھانپا جاتا ہے۔ایک طرف ایسی صورتحال ابھر رہی تھی،دوسری طرف سخت اسلامی پردہ کی اجازت ایسے مطالبات کے ساتھ ساتھ دہشت گردی کے واقعات میں مردوں کے برقعہ پہن کر فرار ہونے کے واقعات بھی سامنے آنے لگے۔اس سے مغربی دنیا میں جہاں پردہ کے مسئلہ کو ویسے ہی اہمیت نہیں دی جاتی وہاں یہ احساس بڑھتا گیا کہ مسلمان مرد پردہ کی آڑ میں تخریبی سرگرمیاں جاری رکھنا چاہتے ہیں۔۲۰۰۷ء کے اوائل میں برطانیہ میں دہشت گردی کے واقعہ میں ملوث ایک نوجوان کو برقعہ پہن کر فرار ہوتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔اُسی برس افغانستان میں قندھار سے ۳۵ کلومیٹر دور پنجوائی کی چیک پوسٹ پر سینئر طالبان کمانڈر ملا محمود کو برقعہ پہن کر فرار ہوتے ہوئے گرفتار کیا گیا،موصوف نے برقعہ کے نیچے زنانہ لباس بھی پہن رکھا تھا۔لال مسجد آرمی ایکشن کے موقعہ پر مولوی عبدالعزیز برقعہ پہن کر فرار ہوتے ہوئے پکڑے گئے۔ایسے مواقع پر مذہبی حلقوں میں سے کسی نے بھی اسلامی پردہ کے ناجائز استعمال کی مذمت نہیں کی۔اگر مذہبی حلقوں کی طرف سے دہشت گردی کے لیے مردوں کی طرف سے پردہ کے ناجائز استعمال کی بروقت اور شدید مذمت کر دی جاتی تو شاید اہلِ مغرب کو اس حوالے سے اپنا موقف سمجھانے میں کچھ آسانی ہوتی۔ایسے ماحول کے ہوتے ہوئے اب تازہ ترین واقعہ یہ ہوا کہ نائجیریا کا ایک ۲۴ سالہ باشندہ عمر فاروق عبدالمطلب اپنے انڈر ویئر میں

دھماکہ خیز مواد چھپا کر ایمسٹرڈیم سے جہاز میں سوار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔امریکی ائیر پورٹ ڈیٹرائٹ پر اترنے سے پہلے اس نے دھماکہ کرنا چاہا لیکن اس میں کامیاب نہ ہو سکا اور صرف خود نیچے سے جھلس کر زخمی ہو گیا۔یہ واردات کرسمس کے موقعہ پر کی جا رہی تھی جو اتفاق سے ناکام ہو گئی۔ابھی تک امریکہ و یورپ کے ہوائی اڈوں پر سکیننگ کا طریق کار ایسا تھا کہ اس میں مسافروں کی ایکسرے جیسی تصویر آتی تھی،لیکن اس ناکام واردات کے بعد سکیننگ کا جو نیا طریقہ رائج کیا جا رہا ہے اس میں مسافران کرام مکمل برہنہ دکھائی دیں گے۔سکیننگ کی یہ پابندی ان ملکوں کے مسافروں کے لیے امریکہ نے لاگو کر دی ہے:

ایران، سوڈان، شام، نائیجیریا، الجیریا،عراق، لیبیا،افغانستان،صومالیہ،یمن، کیوبا،سعودی عرب اور پاکستان۔ان چودہ ممالک سے امریکہ آنے والے تمام مرد و خواتین کو اب اس باڈی سکریننگ سے گزرنا ہوگا۔یورپ میں بھی یہی طریق اختیار کیے جانے کی خبریں ہیں۔اب یہاں عملاً یہ تکلیف دہ صورت سامنے آئی کہ خواتین مکمل برقع میں ہوں تب بھی انہیں مکمل برہنہ دیکھا جا رہا ہوگا۔اس ساری بدلتی ہوئی صورتحال پر پاکستان میں ہی کچھ احتجاج ہوا ہے،دوسرے مسلمان ملکوں کی حکومتوں یا عوام کی طرف سے کسی قسم کا کھلا ردِعمل سامنے نہیں آیا۔جو ہو رہا ہے، برا ہو رہا ہے۔خدا کرے کہ مذاکرات کر کے اس سکیننگ کو ختم کرا لیا جائے لیکن کیا اس وقت اس نئی ٹیکنالوجی کے سامنے ہمارے سارے پردے اور حجاب چاک ہو کر نہیں رہ گئے؟اور کیا اس کی ایک حد تک بڑی ذمہ داری خود ہم پر عائد نہیں ہوتی کہ ہم نے اپنے غم و غصہ کے اظہار کے جو طریقے اختیار کیے،ان کے نتیجہ میں نوبت یہاں تک پہنچا دی۔

روزنامہ **مقدمہ** کراچی مورخہ۔۔۲۸ رجنوری ۲۰۱۰ء

روزنامہ **ہمارا مقصد** دہلی مورخہ ۲۹ رجنوری ۲۰۱۰ء

کچھ اور باتیں مشرق و مغرب کی

پردے سے سکیننگ تک جو کچھ عملی طور پر سامنے آ رہا ہے،اس میں مختلف جہات سے مزید پیش قدمی ہوئی ہے۔فرانس نے پردے پر مکمل پابندی عائد کر دی ہے۔جو خواتین پردے میں باہر آئیں گی انہیں جرمانہ کی سزا ہوگی۔اگر کسی کے پردے کی وجہ اس کے خاندان کے مردوں کا دباؤ ہوگا تو مردوں کو ڈبل جرمانہ ہوگا۔اس سلسلہ میں فرانس میں مقیم بعض علمائے کرام نے صاف لفظوں میں نہ صرف اس فیصلے پر صاد کیا ہے بلکہ یہ بھی کہا ہے کہ جنہیں یہ قانون منظور نہیں ہے وہ مسلمان اپنے اپنے ملکوں میں واپس چلے جائیں۔پردے پر پابندی کے قانون کو اب دوسرے یورپی ممالک میں بھی سنجیدگی سے دیکھا جا رہا ہے۔اسی طرح ہوائی اڈوں پر سکیننگ کے نئے سسٹم کے سلسلہ میں امریکہ کے بعد یورپی ممالک نے بھی غور شروع کر دیا ہے۔اس سلسلہ میں سب سے زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ تیرہ مسلمان ملکوں میں سے گیارہ ملکوں کے عوام یا حکومتوں کی طرف سے حتیٰ کہ سعودی عرب کی طرف سے بھی کوئی ردِعمل سامنے نہیں آ رہا۔تھوڑا سا ایران کی طرف سے اور زیادہ تر پاکستانی عوام کی طرف سے ہی ردِعمل آیا ہے۔اس کا جواب امریکہ کی طرف سے یہی ہے کہ جسے یہ سب پسند نہیں ہے وہ امریکہ میں نہیں آئے۔دوسرے لفظوں میں اس بات کو یوں کہہ لیں کی امریکہ میں صرف وہی مرد و خواتین تشریف لائیں جو اپنی مکمل سکیننگ کے لیے راضی ہوں۔اب کون ہے جو امریکہ جانے والوں کی لسٹ جاری کرتا رہے تا کہ اندازہ ہو کہ پاکستانی عوام و خواص میں امریکہ جانے کی خواہش کم ہوئی ہے یا جوں کی توں موجود ہے۔اس امریکی حکم کے بعد خود مغربی دنیا میں بھی تھوڑا بہت احتجاج ہوا ہے۔جرمنی میں

برلن ائرپورٹ پر پیراٹن پارٹی کے کارکنوں نے نیم سے کچھ زیادہ برہنہ ہوکر ائرپورٹ پر جا کر اپنا احتجاج ریکارڈ کرایا ہے۔آج کل جرمنی میں ہونے والی شدید ترین برف باری کے موسم میں ایسا مظاہرہ کرنا بجائے خود بہت بڑی ہمت کا کام تھا۔اس مظاہرہ کے چند مناظر اس لنک پر دیکھے جا سکتے ہیں۔

http://www.tutsi.de/piratenpartei-nackt-gegen-nacktscanner
-demo-am-flughafen-berlin-tegel/2010/01/11/tutsi-blog-aktuell/

نائن الیون کے بعد افغانستان اور بعد ازاں عراق پر امریکی حملے کے وقت سب سے پہلے احتجاجی مظاہرے مغربی دنیا کے عوام نے شروع کیے۔ پاکستان میں ملین مارچ کا لفظ ایک مذہبی جماعت کے رہنما نے لطیفہ بنا کر رکھ دیا تھا۔لیکن مغربی دنیا کے عوام نے امریکی حملوں کے خلاف جتنے بڑے مظاہرے کیے،وہ نہ صرف ملین مارچ تھے بلکہ رائے عامہ کے اظہار کا شاندار سلسلہ تھے۔یوں دیکھا جائے تو مغربی دنیا کے عوام اپنے ثقافتی فرق کے باوجود امریکی حملوں کے خلاف کئی مسلمان ملکوں سے کہیں زیادہ زبردست مظاہرے کر چکے ہیں۔مغربی دنیا کے عوام نے دو عالمی جنگوں کی وسیع تر تباہی کے بعد بہت کچھ سیکھ لیا ہے۔دونوں عالمی جنگیں تو کسی مذہب کے خلاف سازش نہیں تھیں۔جنگوں کا معاملہ عموماً سیاسی و اقتصادی مفادات سے متعلق ہی ہوتا ہے۔مذہب کا نام کہیں آتا بھی ہے تو محض لوگوں کے جذبات سے کھیلنے کے لیے آتا ہے۔یہاں اس افسوسناک حقیقت کی طرف توجہ دلانا بھی ضروری ہے کہ بعض مسلمان ملکوں کی بادشاہتوں نے اپنے ملکوں میں عوام کو ایسے مظاہرے کرنے کی اجازت تک نہیں دی تھی۔اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ظلم،زیادتی اور ناانصافی کے خلاف آواز بلند کرنے میں مغربی ممالک کے عوام اور مسلمان ملکوں بلکہ تیسری دنیا کے عوام میں زیادہ فرق نہیں ہے۔دوسری طرف امریکی حکام اور مسلمان ملکوں کے حکام کی ذہنی ہم آہنگی میں بھی زیادہ فرق نہیں ہے۔بلکہ اس بات کو مزید صراحت سے کہا جائے تو کہہ سکتے ہیں کہ مسلمان ملکوں کے حکام امریکی احکامات پر صاد کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔اس

معاملہ میں پاکستان ہو یا سعودی عرب دونوں میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ایسا بھی ہوا ہے کہ اگر کسی معاملہ میں پاکستانی حکام کی طرف سے کچھ ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا جانے لگا تو امریکہ نے سعودی عرب کے ذریعے پاکستان کو اس کام کے لیے راضی کر لیا۔سو مغربی دنیا کے حکام سے سیاسی سطح پر جو شکایات ہیں،وہ شکایات لگ بھگ اتنی ہی اپنے حکام سے بھی ہونی چاہئیں۔اگر اپنے حکام کو ہم اپنے موقف کا قائل نہیں کر سکتے تو امریکی حکام اور مغربی دنیا کے مقتدر لوگوں کو کیسے قائل کر سکتے ہیں۔

مسلم امہ اور عالمِ اسلام کے حوالے سے جو باتیں عام طور پر کہی جاتی ہیں،ان کے سلسلہ میں ہم خود بھی بعض مغالطّوں کا شکار ہیں۔عقیدے کی وہ برتر سطح جہاں ایک خدا،ایک رسول اور ایک کتاب پر ایمان اور ایک ہی قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا،حج،عمرہ کے لیے خانہ کعبہ تک جانا وغیرہ شامل ہیں،یہ تو سب میں مشترک ہیں۔اس کے بعد ایمانیات سے ہٹ کر عملی زندگی کے معاملات میں مذہب کی تفسیر تشریح سب نے الگ الگ کر رکھی ہے۔اس میں کوئی حرج نہیں،اگر ایک دوسرے کے عقائد کو تحمل کے ساتھ برداشت کیا جا سکے تو اچھی بات ہے۔لیکن سیاسی سطح پر،حکومتوں کی سطح پر مسلمانوں کی تاریخ اقتدار کی لڑائیوں اور طاقت کے کھیل سے بھری پڑی ہے۔سیاست میں،حکومت میں،اقتدار کی جنگ میں،طاقت کے کھیل میں،ہماری تاریخ میں کچھ اور لکھا ہوا ہے اور ہم لوگوں کو کچھ اور بتایا اور پڑھایا گیا ہے۔تاریخ کے چند اہم ترین،ناقابلِ یقین واقعات کی ایک ہلکی سی جھلک اگلے کالم میں پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔میں اگلے کالم میں جو چند حقائق پیش کروں گا ان سے کئی مغالطے دور ہو سکتے ہیں۔

روزنامہ **مقدمہ** کراچی مورخہ۔۲رفروری ۲۰۱۰ء
روزنامہ **ہمارا مقصد** دہلی مورخہ ۴رفروری ۲۰۱۰ء

مسلمان حکمرانوں کی تاریخ: ایک جھلک

گزشتہ کالم میں عرض کر چکا ہوں کہ ایک خدا، ایک رسولؐ، ایک قرآن اور ایک کعبہ کی حد تک سارے مسلمانوں کی یکجہتی ایک حقیقت ہے۔ اس سے آگے فرقہ پرستی کے نتیجہ میں مذہبی تفریق کا اندوہناک منظر ہے۔ یہ جو مسلم امہ اور امتِ مسلمہ کی باتیں کی جاتی ہیں، میں بھی پہلے اسی انداز میں سوچتا تھا، لیکن حسن جعفر زیدی، پروفیسر مہدی حسن، ڈاکٹر مبارک علی اور فرزندِ اقبال جسٹس جاوید اقبال جیسے دانشوروں کو پڑھنے، ٹی وی پر سننے اور سمجھنے کے بعد اندازہ ہوا کہ ہم لوگ تو اسلامی تاریخ کے نام پر نسیم حجازی کے ناولوں کے نشہ میں پڑے ہوئے ہیں۔ سیاسی اقتدار کی رسہ کشی میں مسلمان حکمرانوں کی ڈیڑھ ہزار سالہ داستان قتل و غارت، ناانصافی اور خودغرضی کے خوفناک واقعات سے بھری ہوئی ہے۔ حقیقتاً ان حقائق کا بحیثیت مذہب اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے، یہ اقتدار کا کھیل ہے اور اس کھیل میں مذہب کا کوئی عمل دخل نہیں رہتا، بس کہیں اقتدار کو مضبوط کرنے کے لیے مذہبی اشتعال انگیزی سے کام لیا جا سکتا ہے تو صرف بوقتِ ضرورت ایک حد تک اس سے کام لے لیا جاتا ہے۔ آج کے کالم میں اس ڈیڑھ ہزار سالہ تاریخ کی ہلکی سی جھلک پیش کروں گا۔

خلافتِ راشدہ کے چار میں سے تین خلفاء شہید ہوئے اور ان میں سے صرف ایک خلیفہ ایک غیر مسلم کے ہاتھوں شہید کیے گئے لیکن دو خلفاء مسلمانوں ہی کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ حضرت امام حسین علیہ السلام کے خلاف پہلے یزیدی حاکمیت نے اس وقت کے چیف جسٹس قاضی شریح

سے تکفیر اور قتل کا فتویٰ حاصل کیا اور پھر سانحۂ کربلا برپا کیا۔ اُس وقت کی آزاد عدلیہ کے چیف جسٹس قاضی شریح نے لکھا کہ حسین ابن علی دینِ محمدؐ سے باغی، دائرۂ اسلام سے خارج اور واجب القتل ہے۔ **انا لله وانا اليه راجعون**. یہ اپنے اقتدار کو بچانے کے لیے مسلمان حکمرانوں میں سرکاری طور پر تکفیر کا پہلا المناک سانحہ تھا۔ نوے سالہ امیہ دورِ خلافت میں مکہ اور مدینہ پر دو بار حملہ کیا گیا۔ ایک حملہ کی قیادت حجاج بن یوسف نے کی۔ دونوں حملوں میں خانہ کعبہ کی عمارت پر منجنیق سے پتھر برسائے گئے اور آگ کے تیر چلائے گئے۔ دونوں حملوں میں خانہ کعبہ کی عمارت منہدم کر دی گئی، بعد میں تعمیرِ نو کی گئی۔ مسجد نبوی کی بے حرمتی کی گئی۔ مکہ اور مدینہ پر حملہ کے وقت ہزاروں کی تعداد میں مسلمانوں کو شہید کر دیا گیا۔ حجاج بن یوسف نے کوفہ میں ایک لاکھ تیس ہزار مسلمانوں کو شہید کر دیا۔ مختار ثقفی نے قاتلین حسینؓ کو عبرتناک انجام تک پہنچایا، مصعب بن عمیر اور مختار کی جنگ میں مختار مارا گیا، حجاج اور مصعب کی جنگ میں مصعب مارا گیا، اندلس میں فتح حاصل کرنے کے بعد فاتح مسلمانوں کے درمیان خانہ جنگی شروع ہو گئی جس کے نتیجہ میں ہزاروں مسلمان ،مسلمانوں کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتارے گئے۔ مدینہ پر خارجیوں نے حملہ کیا اور ہزاروں مسلمانوں ہی کا قتل عام ہوا۔ خلافت کے دو دعویدار ابراہیم بن ولید اور مروان بن محمد کے درمیان خونریز جنگ ہوئی۔ یزید ثالث کی لاش کو قبر سے نکال کر سولی پر چڑھایا گیا۔ فاتح سندھ محمد بن قاسم، فاتح وسط ایشیا مسلم بن قتیبہ، اور فاتح اندلس موسیٰ بن نصیر کے تمام بیٹوں کو مروا دیا گیا۔ اس قسم کے اور بے شمار واقعات ہیں جو مسلمانوں کی عظیم فتوحات کے دور میں رونما ہو رہے تھے۔ اور مسلم امہ یا اسلامی بھائی چارے جیسے الفاظ کا مذاق اڑا رہے تھے۔

جب امیہ دور کا زوال آیا اور عباسیوں کو عروج حاصل ہوا تو امیر معاویہ اور عمر بن عبدالعزیز کے سوا باقی تمام اموی حکمرانوں کی لاشیں قبروں میں سے نکال کر جلا دی گئیں۔ اموی اندلس پر حکمران تھے اور عباسی بغداد پر۔ فرانس کے بادشاہ شارلمین نے جب اندلس پر حملہ کیا تو خلیفہ ہارون الرشید نے شارلمین کو قیمتی تحائف بھیجے۔ امیہ اور عباسیہ کی جنگوں میں اندلس اور افریقہ کے ہزاروں مسلمان مارے گئے۔ عباسی اقتدار کے بانی ابومسلم خراسانی نے اپنے عرب حریف

ابوسلمہ کو قتل کرادیا، ابوجعفر منصور نے ابومسلم خراسانی کو قتل کرادیا، ان ساری لڑائیوں میں ستر ہزار سے زیادہ مسلمان موت کے گھاٹ اتر گئے۔قرامطی مکہ پر حملہ آور ہوئے اور حجر اسود کو اکھاڑ کر ساتھ لے گئے۔عباسی دور کے پانچ سو سال میں ۳۷ خلفاء بنے۔ان میں سے پندرہ کو قتل کیا گیا۔چودہ خلفاء اپنے مسلمان بھائیوں کے ہاتھوں مارے گئے جبکہ آخری عباسی خلیفہ تاتاریوں کے ہاتھوں مارا گیا۔تاتاری یلغار کے وقت مسلمانوں میں فرقہ پرستی اور تکفیر بازی کی لعنت اس حد تک سرایت کرگئی تھی کہ ایک فرقہ کے لوگ تاتاریوں سے سازباز کر کے یقین دہانی حاصل کرتے کہ شہر کا دروازہ کھول دینے پر تاتاری ان کے مخالف فرقے والوں کا قتلِ عام کریں گے۔جب دروازہ کھلتا تو کسی فرقہ کے امتیاز کے بغیر تاتاریوں نے سب کا قتلِ عام کیا۔ایسا صرف ایک بار نہیں ہوا۔کئی شہروں کے دروازے کھولنے والوں نے ہر بار یہی احمقانہ سازباز کی اور اپنے انجام کو پہنچے۔خلافتِ عثمانیہ میں محمد ثالث جب خلیفہ بنا تو اس نے اپنے انیس بھائیوں کو قتل کروادیا۔کسی مذہبی رہنما نے اسے اسلام کے منافی نہ کہا۔ایرانیوں، افغانیوں اور ترکوں کی باہمی جنگوں میں مفتوحین کے سروں کے مینار بنائے جاتے۔داخلی طور پر اپنے بھائیوں، بیٹوں کی آنکھوں میں گرم سلائیاں پھروا کر اندھا کرادینا تو معمولی بات تھی۔بھائیوں، بیٹوں کو قتل بھی کروایا جاتا رہا۔

غزنوی سلطنت میں محمود غزنوی نے خوارزم، خراسان، فارس اور ملتان کی مسلمان حکومتوں کا خاتمہ کر کے قبضہ کرلیا۔خلیفہ بغداد کو بغداد پر حملہ کرنے کی دھمکی دی، جسے خلیفہ نے قرآن کا واسطہ دے کر روکا۔غوریوں کو موقعہ ملا تو انہوں نے غزنی کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔سات روز تک قتلِ عام ہوتا رہا، لاکھوں مسلمان ماردیئے گئے۔غزنوی بادشاہوں کی قبریں اکھاڑ کر لاشیں جلادی گئیں۔کیسی کمال کی بات ہے کہ غزنوی اور غوری دونوں ہی ہمارے ہیرو ہیں۔ہندوستان میں التمش کی اولاد میں تخت نشینی کی جنگ میں رضیہ سلطان کا قتل، جلال الدین خلجی کے ہاتھوں کیقباد کا قتل، علاؤالدین خلجی کے ہاتھوں جلال الدین خلجی کا قتل، ظہیرالدین بابر اور ابراہیم لودھی کے درمیان پانی پت کی جنگ اور جنگ میں ابراہیم لودھی کا قتل، یہ سب ہماری تاریخ کا حصہ ہے۔بابر کی اولاد میں تخت نشینی کی جنگ میں ایک دوسرے کا قتل، جہانگیر نے اپنے بیٹے خسرو سے جنگ کی

اور قید ہی میں خسرو کی موت ہوئی۔شاہ جہاں کی طرف سے اقتدار کے لیے اپنے چچا زاد بھائیوں، اور بھتیجوں کا قتل، شاہجہاں کے بیٹوں میں اقتدار کی جنگ میں اورنگ زیب کے ہاتھوں باقی سارے بھائیوں کا قتل۔مغلوں کے زوال تک ان کی محلاتی سازشوں اور اندرونی ظلم وغارت گری کے باعث خون کے رشتے 'خونی' رشتے بنے رہے، خون بہتا رہا۔کیا اس خونی تاریخ کے ان ابواب میں بھی کافروں کی سازشیں کارفرما تھیں؟ کون ہے کتنا گنہگار کہوں یا نہ کہوں!

جن احباب کو یہ کالم پسند آئے اس کی داد بطورِ خاص حسن جعفر زیدی صاحب کو دی جائے، جن سے میں نے استفادہ کیا ہے، جنہیں پسند نہ آئے تو ان کی ساری ملامت کا سزاوار میں خود ہوں۔

روزنامہ **مقدمہ** کراچی مورخہ ۴رفروری ۲۰۱۰ء

روزنامہ **ہمارا مقصد** دہلی مورخہ ۶رفروری ۲۰۱۰ء